سبق: 5

تعلیم القرآن ۱ء

آن لائن اکیڈمی

(سورۃ یوسف ،آیت 36 تا 42)

وَ دَخَلَ مَعَهُ السِّجۡنَ فَتَیٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّیۡۤ اَرٰىنِیۡۤ اَعۡصِرُ خَمۡرًا ۚ وَ قَالَ الۡاٰخَرُ

اور ان کے ساتھ دو اور نوجوان زندان میں قید ہوئے، ان میں سے ایک نے کہا کہ میں نے (خواب میں) دیکھا ہے کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے کہا کہ بے شک میں نے دیکھا ہے کہ میں نے اپنے سر پر روٹی اٹھائی

آیت 36 ﴿ وَ دَخَلَ مَعَهُ السِّجۡنَ فَتَیٰنِ : مصر میں معاشرتی بگاڑ اور یوسف علیہ السلام کے پاکیزہ کردار کے تذکرے کے بعد اب یوسف علیہ السلام کی دعوت کا ذکر ہو رہا ہے۔ ہر بات بڑے تسلسل کے ساتھ بیان ہو رہی ہے۔ یہ واقعہ اس انداز سے نہیں ہے جیسے لوگوں کی طرف سے قصے لکھے جاتے اور سنائے جاتے ہیں۔ اس کا مقصد عقیدے اور اخلاق و کردار کی دعوت اجاگر کرنا ہے۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ واقعات اور قصوں کو پسند کرتا ہے۔ اکثر انسان ان چیزوں سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے توحید کی دعوت کو اس واقعہ کے ساتھ جوڑ کر بیان کیا ہے، تاکہ سننے میں دلچسپی برقرار رہے اور دعوت کی قبولیت میں بہتر کیفیت پیدا ہو۔ یہ قرآن مجید کا شان دار اسلوبِ دعوت ہے۔ آج بھی اگر داعی حضرات توحید کی دعوت سمجھانے کے لیے قرآن میں بیان کردہ نوح علیہ السلام اور دوسرے نبیوں کی قوموں کے حالات اور ان کی عقیدے کی خرابیاں بیان کریں اور پھر دلائل کے ساتھ شرک سے بچنے پر زور دیں تو سننے والا غور سے سنے گا، سمجھے گا اور عقیدۂ توحید کی طرف مائل بھی ہو گا، لیکن اگر دوسروں کے نام لے کر ان کی برائیاں بیان کی جائیں گی تو اس سے لوگ قریب آنے کی بجائے دور بھاگتے ہیں۔

نوح علیہ السلام اور دوسرے نبیوں کی محبت ہر مسلمان کے دل میں موجود ہے۔ جب آپ ان کے واقعات بیان کریں گے تو بندہ ضرور سوچنے پر مجبور ہو گا کہ واقعتاً کہیں میں شرک کا مرتکب تو نہیں ہو رہا اور مجھ سے کوئی اور عقیدے کی

اِنِّیۡۤ اَرٰىنِیۡۤ اَحۡمِلُ فَوۡقَ رَاۡسِیۡ خُبۡزًا تَاۡكُلُ الطَّيۡرُ مِنۡهُ ؕ نَبِّئۡنَا بِتَاۡوِيۡلِهٖ ۚ اِنَّا

نَرٰىكَ مِنَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ ﴿۳۶﴾

ہوئی ہے، جس کو پرندے کھا رہے ہیں (دونوں کہنے لگے) ہمیں اس کی تعبیر بتا دیجیے، بے شک ہم سمجھتے ہیں کہ آپ نیک لوگوں میں سے ہیں ﴿36﴾

غلطی تو نہیں ہو رہی۔ اللہ رب العالمین نے قرآن مجید میں یہی اسلوبِ دعوت اختیار کیا ہے اور یہ دعوت پیش کرنے کا شان دار طریقہ ہے۔ یوسف علیہ السلام نے بھی مصر کے اس معاشرے میں دین کی دعوت پیش کی ہے اور اسی حوالے سے یہ واقعہ بیان ہو رہا ہے۔ یوسف علیہ السلام کو جب قید میں ڈالا گیا تو دو اور نوجوان وہاں آ گئے۔ مفسرین بیان کرتے ہیں کہ ایک نوجوان وہ تھا جو شراب نچوڑ کر بادشاہ کو پلایا کرتا تھا اور دوسرا نان بائی تھا جو کھانا وغیرہ پکاتا تھا۔ دونوں بادشاہ کے خاص مصاحبین میں سے تھے۔

بعض مفسرین نے ان نوجوانوں پر لگائے گئے مختلف الزامات کا ذکر کیا ہے لیکن قرآن مجید نے اسے بیان نہیں کیا، اس لیے ہمیں بھی اس حوالے سے کوئی نہ کوئی بات لازماً تلاش کرنے کی بجائے اصل مقصد کو ہی واضح کرنا چاہیے۔ ان چیزوں سے حقیقی مقصد چھپ جاتا ہے اور دوسری چیزیں زیادہ اجاگر ہو جاتی ہیں۔ بعض واعظین کی زیادہ توجہ انھی باتوں پر ہوتی ہے کہ وہ جیل میں کیوں آئے تھے اور کیوں گرفتار ہوئے تھے؟ پھر وہ لوگوں کی توجہ بھی اسی طرف دلاتے رہتے ہیں تو ان چیزوں کی بجائے قرآن مجید کے اسلوب کا اعتبار کرنا چاہیے اور اسی کے مطابق چلنا چاہیے۔ بات صرف اتنی ہے کہ یوسف علیہ السلام گرفتار ہوئے تو دو اور لوگ بھی گرفتار ہو کر وہاں آ گئے۔

قَالَ اَحَدُهُمَاۤ اِنِّیۡۤ اَرٰىنِیۡۤ اَعۡصِرُ خَمۡرًا . . . : قید کے دوران ایک دن دونوں نے خواب دیکھا، ایک نے دیکھا کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں اور دوسرے نے دیکھا کہ میرے سر پر روٹیاں ہیں اور پرندے آ کر اسے نوچ کر کھا رہے ہیں۔ دونوں نے اپنا خواب یوسف علیہ السلام کے سامنے بیان کیا اور درخواست کی: ﴿نَبِّئۡنَا بِتَاۡوِيۡلِهٖ﴾ آپ ہمیں اس کی تعبیر بتا دیں اور ساتھ ہی کہنے لگے: ﴿اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الۡمُحۡسِنِيۡنَ﴾ بے شک ہم آپ کو محسن شخص دیکھ رہے ہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھیں کس طرح معلوم ہوا کہ یوسف علیہ السلام تعبیر بتانے کی اہلیت یا صلاحیت رکھتے ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے انھوں نے جیل میں رہتے ہوئے یوسف علیہ السلام کی فہم و فراست، عبادت میں خشوع و خضوع اور اپنے رب سے تعلق اور بہترین اخلاق دیکھ لیا ہو۔ یوں بھی یہ بات طے شدہ ہے کہ نیکی انسان کی ظاہری شخصیت، اس کے چہرے اور وضع قطع پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ عام طور پر انسان کسی بھی شخص کو دیکھ کر ہی اندازہ لگاتا ہے کہ یہ کتنا پڑھا لکھا اور بات کو سمجھنے

قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا

(یوسف علیہ السلام نے) کہا جو کھانا تمھیں دیا جاتا ہے اس کے تمھارے پاس آنے سے پہلے میں تمھیں اس کی تعبیر بتادوں گا،

والا ہے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: ((أَوْلِيَاءُ اللهِ الَّذِيْنَ إِذَا رُءُوْا ذُكِرَ اللهُ)) [سلسلة الأحاديث الصحيحة: ٤/ ٣١١، ح: ١٧٣٣] ''اللہ کے اولیاء وہ ہیں کہ جنھیں دیکھ کر اللہ یاد آجائے۔'' یہ ساری چیزیں یوسف علیہ السلام کے چہرے پر بھی بڑی واضح تھیں۔

یوسف علیہ السلام بے گناہ ہونے کے باوجود جس طرح جیل میں قید ہوئے اور اللہ تعالیٰ نے انھیں برائی سے محفوظ رکھا، ان چیزوں سے بندے میں بہت خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ جیل میں قید ان نوجوانوں نے بھی جب دیکھا کہ یوسف علیہ السلام بڑے علم وفہم والے اور نیک شخص ہیں تو انھوں نے بھی یوسف علیہ السلام سے اپنے خواب کی تعبیر پوچھ لی۔ لوگ برے بھی ہوں تو اچھے اور نیک انسان کو ضرور پسند کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فطری طور پر کچھ خوبیاں ہر کسی میں رکھی ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر آپ دعوت کے کام کو مؤثر بنانا چاہتے ہیں تو برائی سے بچیں اور نیکی و عبادت میں پختگی اختیار کریں۔ ان چیزوں سے ہی بندہ محسن بنتا ہے اور لوگ بھی متاثر ہوتے ہیں۔ ایک داعی کے لیے یہ چیزیں بہت ضروری ہیں۔

آیت 38،37 قَالَ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهٖٓ . . . . : ''(یوسف علیہ السلام نے) کہا جو کھانا تمھیں دیا جاتا ہے اس کے تمھارے پاس آنے سے پہلے میں تمھیں اس کی تعبیر بتادوں گا۔'' داعی حضرات کو معاشرے میں ذاتی حوالے سے ایسا اچھا تاثر قائم کرنا چاہیے کہ لوگ ان کے پاس آکر اپنے مسائل اور مشکلات پیش کر کے ان کا حل طلب کریں۔ جب دعوت دینے والوں کا عام لوگوں سے یہ تعلق قائم ہوتا ہے تو پھر ان کی بات کا اثر بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کی اس خوبی کو بھی دعوت کے طور پر بیان کیا اور اسے بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ ظاہر ہے وہ نوجوان یوسف علیہ السلام کے ساتھ کچھ عرصہ رہے ہوں گے، انھوں نے یوسف علیہ السلام کی عبادت اور ان کے معاملات کو دیکھا اور ان کی گفتگو کو سنا ہوگا، اسی لیے وہ ان چیزوں سے متاثر ہوئے۔ خواب دیکھنے کے بعد ان کی دلچسپی اس بات میں تھی کہ ہمیں ہماری خوابوں کی تعبیر ملنی چاہیے۔ وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ یوسف (علیہ السلام) ہی ایسے شخص ہیں جو انھیں صحیح تعبیر بتا سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ ان کے پاس آئے اور اپنے خواب بیان کر دیے۔ یوسف علیہ السلام کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے، کھانا آنے والا ہے، اس سے پہلے میں تمھیں تمھارے خوابوں کی تعبیر بتادوں گا۔

جیلوں میں کھانے کا وقت ہوتا ہے اور اس دوران بیرکیں کھلتی ہیں۔ قید میں پڑے لوگوں کو عام طور پر کوئی پوچھتا نہیں ہے البتہ کھانا دینے کے اوقات مقرر ہوتے ہیں اور اسے بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ قیدیوں کو اس وقت کا

عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ ؕ اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ

كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾ وَ اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ ؕ مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ

اس کا علم مجھے میرے رب نے سکھایا ہے۔ بے شک میں نے ان لوگوں کا دین چھوڑ دیا جو اللہ پر ایمان نہیں لاتے اور وہ آخرت کے بھی منکر ہیں ﴿37﴾ اور میں نے اپنے باپ دادا ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کے دین کی پیروی کی، ہمارے

خاص انتظار رہتا ہے، بہر حال آپ اندازہ کریں کہ یوسف علیہ السلام نوجوانوں کو دعوت پیش کرنے کے لیے ان کا ذہن تیار کر رہے ہیں تا کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ یوسف (علیہ السلام) ان کی بات بھول گئے ہیں اور ہمارا مسئلہ حل کرنے کی بجائے انھوں نے اپنی بات شروع کر دی ہے۔ یہ اسلوبِ دعوت ہے کہ یوسف علیہ السلام اپنی بات کہنے سے پہلے انھیں یقین دہانی کروا رہے ہیں کہ میں تمھارے خوابوں کی تعبیر جلد بتاؤں گا لیکن اس سے پہلے میں تمھارے ساتھ ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بہترین طریقہ ہے کہ آپ نے لوگوں کو متوجہ کیسے کرنا ہے اور انھیں اپنی بات کس طریقے سے سمجھانی ہے، یعنی پہلے ماحول تیار کرنا اور ذہن سازی کرنی ہے، جب ذہن تیار ہو جائیں تو پھر بات ماننا بھی آسان ہو جاتا ہے۔

ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِیْ رَبِّیْ: یوسف علیہ السلام کہتے ہیں کہ تعبیر کا علم مجھے اللہ رب العالمین نے عطا کیا ہے۔ وہ نوجوانوں میں اعتماد پیدا کر رہے ہیں کہ میں تعبیر اپنے اندازے سے بیان نہیں کروں گا بلکہ یہ تعبیر تو وہ ہو گی جس کے بارے میں رب تعالیٰ نے مجھے خاص علم عطا کیا ہے۔ یہ تعبیر بالکل صحیح ہو گی۔ یوسف علیہ السلام یہ ساری باتیں دلچسپی پیدا کرنے، انھیں متوجہ کرنے اور اپنی بات منوانے کے لیے کر رہے ہیں۔ تعبیر بتانے کے بعد اگر وہ اپنی دعوت پیش کرتے تو یقینی طور پر اس کا اثر وہ نہ ہوتا، ابھی چونکہ تعبیر بیان کرنی ہے اس لیے دلچسپی قائم اور توجہ بہت زیادہ ہے۔ یہ دعوت کے اسلوب سکھائے جا رہے ہیں۔

اِنِّیْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ . . . : یوسف علیہ السلام کہتے ہیں کہ دو الگ الگ ملتیں ہیں، ایک وہ ہے جسے تم اور تمھارے باپ دادا اختیار کر چکے ہو۔ اس میں اللہ کی توحید کا کوئی تصور ہے اور نہ ہی آخرت کا عقیدہ ہے۔ مصر کے رہائشی اسی طریقے پر چل رہے ہیں۔ یہ کافروں کی ملت ہے اور میں اسے اختیار نہیں کرتا۔ میں اس عقیدے سے بیزاری کا اعلان کرتا ہوں۔ ظاہر ہے کہ پوچھنے والے بھی اسی دین اور ملت سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے یوسف علیہ السلام انھیں باور کروا رہے ہیں کہ اگر تم مجھ سے صحیح فائدہ اٹھانا چاہتے ہو تو یہ تمھیں اسی صورت میں ملے گا جب تم بھی مجھ جیسا عقیدہ اختیار کر لو گے اور دوسری بات یہ کہ مجھے یہ علم میرے رب نے عطا کیا ہے اور میں اسی کی روشنی میں تمھیں یہ بات بتانا چاہتا ہوں کہ کائنات کے خالق اور مالک رب تعالیٰ کا انکار کرنے اور آخرت پر ایمان نہ لانے کے

نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَ عَلَى النَّاسِ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ﴿۳۸﴾

لیے روا نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں، یہ (عقیدہ) ہم پر اور سب لوگوں پر اللہ کا فضل ہے اور لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ﴿38﴾

سارے عقیدے سراسر باطل اور گمراہی پر مبنی ہیں۔ یوسف علیہ السلام اس کے بعد اپنے آباء کا تعارف کرواتے ہوئے کہتے ہیں: ﴿اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ یَعْقُوْبَ﴾ دوسری ملت وہ ہے جو میرے باپ ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے اسحاق علیہ السلام اور ان کے بیٹے یعقوب علیہ السلام کی ہے۔ میں انھی کے دین کی پیروی کرتا ہوں۔

یوسف علیہ السلام کی اس بات سے یہ چیز واضح ہوتی ہے کہ یہ تینوں نام بہت مشہور اور محترم تھے، یعنی عقائد کی غلطیوں اور خرابیوں کے باوجود ان ناموں کا لوگوں میں بہت چرچا تھا اور دین حق کے لیے انھیں معیار مانا جاتا تھا۔ اسی لیے یوسف علیہ السلام کہتے ہیں کہ میں تو انبیاء علیہم السلام کے اس سلسلے سے تعلق رکھتا ہوں اور انھی کے دین اور ملت پر ہوں۔ اگر تم مجھے علم و عقل والا اور محسن شخص سمجھتے ہو اور جیل میں رہتے ہوئے تم میری عبادت، میرے رویے اور میری گفتگو سے متاثر ہو تو پھر یہ بات بھی جان لو کہ میں اللہ کی توحید اور عقیدۂ آخرت پر ایمان رکھتا ہوں۔ میں اسی دعوت کا داعی ہوں جو ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام نے پیش کی تھی۔ یوسف علیہ السلام اپنے آباء کا تعارف اس لیے بھی کروا رہے ہیں کہ داعی کی اپنی شخصیت بھی دعوت کی قبولیت میں بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔ اس میں شخصیت پرستی کا بھی ردّ ہے کیونکہ مشرکین کہتے تھے: ﴿نَتَّبِعُ مَا وَجَدْنَا عَلَیْهِ اٰبَآءَنَا﴾ [لقمان: ۲۱] ''ہم تو اس کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباو اجداد کو پایا۔'' اور یوسف علیہ السلام نے فرمایا: ﴿اتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْۤ اِبْرٰهِیْمَ ...﴾ اس کے باوجود کہ وہ نبی تھے پھر بھی فرمایا کہ میں ان اشخاص کی نہیں بلکہ ان کی ملت کی اتباع کرتا ہوں۔

مَا كَانَ لَنَاۤ اَنْ نُّشْرِكَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ: ''ہمارے لیے روا نہیں کہ ہم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں۔'' شرک کا کسی صورت کوئی جواز نہیں ہے۔ اس دور میں بت پرستی اور شرک کی خرابیاں بہت زیادہ تھیں۔ ان کے ہاں جتنے باطل نظام اور قوانین تھے سب کی بنیاد شرک ہی تھی۔ یوسف علیہ السلام خرابی کی اصل جڑ کے متعلق بات کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ایسا دین اور ایسا راستہ ہے جو بالکل غلط ہے۔ میرے آباء نے اس کے خلاف کام کیا تو میں بھی وہی دعوت دے رہا ہوں۔

ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَیْنَا وَ عَلَى النَّاسِ: ''یہ (عقیدہ) ہم پر اور سب لوگوں پر اللہ کا فضل ہے۔'' ابراہیم،

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا

اے میرے زندان کے ساتھیو! کیا بہت سے رب بہتر ہیں یا اللہ، جو اکیلا ہے، سب پر غالب ہے؟ ﴿39﴾ اللہ کو چھوڑ کر جن

اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے بڑے فضل و رحمت سے نوازا تو یہ صرف ہمارے لیے محدود نہیں ہے۔ نبوت سب کے لیے ہی اللہ کی رحمت اور اس کے فضل کا ذریعہ ہوتی ہے۔ ابن جریر طبری رحمہ اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کی تفسیر میں نقل کرتے ہیں کہ "ذٰلِكَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ عَلَيْنَا" سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے ہمیں نبوت عطا کی اور "وَعَلَى النَّاسِ" یعنی لوگوں پر اللہ کے فضل سے مراد ہے کہ اس نے ہمیں ان کی طرف رسول بنا کر بھیجا۔ [تفسير الطبري: ۱۳/ ۱۶۳] یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ نبی کی دعوت تمام لوگوں کے لیے ہوتی ہے اور میرے نزدیک انھی چیزوں کی اہمیت ہے۔ اگر ہم شرک سے محفوظ ہیں تو اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں یہ خالص اللہ کا فضل، اس کی عنایت اور مہربانی ہے۔ کسی کو ہدایت دینا یا نہ دینا رب تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ دنیا تو نافرمانیاں اور بغاوتیں کرنے والوں کو بھی مل جاتی ہے لیکن ہدایت ایسی نعمت ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو ہی عطا فرماتا ہے۔

وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ: "اور لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔" لوگوں کو ان باتوں کا پتا ہی نہیں ہے اس لیے وہ لاعلمی اور جہالت کی وجہ سے شرک میں مبتلا ہو جاتے ہیں، توحید کا عقیدہ چھوڑ بیٹھتے ہیں، ناشکری کرتے ہیں اور اللہ کا حق غیر اللہ کو دے دیتے ہیں۔ یہ سب سے بڑی ناشکری ہے کہ عبادت و اطاعت اللہ کے علاوہ کسی اور کی ہو اور نظام و قوانین بھی اغیار کے مانے جائیں۔ اس کے برعکس شکر یہ ہے کہ جس رب نے پیدا کیا ہے اس کی توحید کو مانا جائے اور اسی کے حکم کو تسلیم کیا جائے۔

آیت 40،39 يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ ....: اللہ کی توحید کی دعوت دی جا رہی ہے اور شرک کا ردّ کیا جا رہا ہے۔ یوسف علیہ السلام کہتے ہیں: اے میرے قید کے ساتھیو! یہ متفرق قسم کے بہت سارے رب جو تم نے بنا رکھے ہیں "خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ" یہ زیادہ بہتر ہیں یا اللہ تعالیٰ جو اکیلا ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے؟! بت پرستی جب شروع ہوئی تو یہ نہیں ہے کہ کسی ایک خدا یا کسی ایک بت پر ہی اکتفا کر لیا گیا بلکہ مشرکین نے بہت سارے خدا بنائے اور پھر ان کے ذمے کام بھی خود ہی لگا دیے کہ فلاں بت بارش برساتا اور فلاں اولاد دیتا ہے تو فلاں بت کوئی اور کام کرتا ہے۔ ان لوگوں نے اپنے معبودوں کے نام بھی خود ہی تجویز کر دیے۔ یوسف علیہ السلام اسی کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ اللہ اکیلا اور غالب ہے۔ اسی کا حکم چلتا ہے اور ہر چیز اس کی قدرت میں ہے۔ اس کے حکم کے خلاف کوئی چیز دم نہیں مار سکتی۔

تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

کی تم عبادت کرتے ہو وہ تو محض کچھ نام ہیں، جو تم نے اور تمھارے باپ دادا نے رکھ لیے ہیں، اللہ نے ان کے بارے

یوسف علیہ السلام بڑے مدلل انداز میں انھیں یہ بات سمجھا رہے ہیں کہ یا تو تم یہ ثابت کرو کہ تم نے اپنے ہاتھوں سے جو خدا بنا رکھے ہیں کیا واقعتاً وہ کسی چیز پر غلبہ حاصل کر سکتے ہیں؟ کیوں کہ ایک سے زیادہ خدا ہوں گے تو ایک کہے گا کہ اسے موت دینی ہے اور دوسرا کہے گا کہ نہیں اسے زندہ رکھنا ہے۔ اسی طرح ایک کہے گا کہ بارش برسانی ہے اور دوسرا کہے گا کہ نہیں ابھی بارش نہیں برسانی۔ اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتے ہیں: ﴿لَوْ كَانَ فِيْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا﴾ [الأنبياء: ۲۲] کہ اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا کوئی اور الٰہ ہوتا تو یقیناً دنیا میں کوئی کام نہ ہوتا، ہر طرف فساد پھیل جاتا۔ یہ نظام اگر جاری ہے اور اس میں تسلسل اور یکسوئی ہے تو اس کا سبب یہ ہے کہ اسے چلانے والا اکیلا اللہ ہے۔ اسی کی عبادت کرنی ہے، اسے ہی الٰہ ماننا ہے اور اسے ہی اپنا رب تسلیم کرنا ہے۔ اللہ ایک ہے، وہ دو، تین یا متعدد نہیں ہیں۔ تم ان باتوں پر تھوڑا غور کرو اور عقل و فہم سے کام لو کہ ایک اللہ بہتر ہے یا بہت سارے رب بہتر ہیں۔

یوسف علیہ السلام کی پیش کردہ اس دعوت سے پتا چلتا ہے کہ داعیان کو دوسروں پر خواہ مخواہ تنقید کی بجائے انھیں دلیل کے ساتھ سمجھانا چاہیے۔ کبھی کبھار دوسروں کو زچ کر کے لاجواب کرنے والے انداز کی بھی ضرورت ہو سکتی ہے، جیسے ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کو بے بس کر دیا تھا۔ وہ بادشاہ تھا اور طاقت ور خدا بن کر بیٹھا تھا، ایسے میں ابراہیم علیہ السلام نے اس کے سامنے دلیل پیش کی کہ میرا رب سورج کو مشرق سے طلوع کرتا اور مغرب میں غروب کرتا ہے تو اگر واقعی خدا ہے تو آج اسے مغرب سے طلوع کر کے دکھا، پھر ہم تجھے رب مان لیں گے۔ ابراہیم علیہ السلام کی اس بات پر نمرود لاجواب ہو گیا۔ اللہ رب العزت فرماتے ہیں: ﴿فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ﴾ [البقرة: ۲۵۸] ”تو وہ کافر حیرت زدہ ہو گیا۔“ بہر حال دعوت میں یہ انداز کبھی کبھار ہوتا ہے۔ نمرود کا معاملہ درحقیقت بہت مختلف تھا۔ دنیا میں بڑے بڑے فرعونوں کے سامنے ہمیشہ ڈٹ کر بات کرنی چاہیے اور ان کے سامنے جھکنا نہیں چاہیے لیکن عام لوگوں کے سامنے دعوت کا اسلوب ہمیشہ بہت مدلل اور واضح ہونا چاہیے۔

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً . . . .: ”اللہ کو چھوڑ کر جن کی تم عبادت کرتے ہو وہ تو محض کچھ نام ہیں۔“ یہ نام کے خدا ہیں جن کی کچھ بھی حقیقت نہیں ہے۔ یہ نام بھی وہ ہیں جو ”سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَ اٰبَآؤُكُمْ“ تم نے اور تمھارے باپ دادا نے خود رکھے ہیں۔ جس قسم کا خدا تمھیں چاہیے ہوتا ویسا ہی تم نے اس کا نام رکھ لیا۔ یہ تو محض فرضی اور خیالی چیزیں ہیں۔ مشرکین کی دلیل یہ ہوتی تھی کہ فلاں کام ہمارے باپ دادا نے یوں کیا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ باپ

بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ

میں کوئی دلیل نازل نہیں کی، فرماں روائی صرف اللہ کی ہے، اسی نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو،

دادا پر بھی یہ چیزیں ختم نہیں ہوتیں، یہ سلسلہ پھر چلتا رہتا ہے۔ کچھ پرانے خدا ہوتے ہیں تو کچھ نئے ہوتے ہیں۔ جب نئے حالات پیدا ہوتے ہیں اور نئے تقاضے اور نئی ضرورتیں ہوتی ہیں تو معبود بھی نئے بن جاتے ہیں، اسی لیے یوسف علیہ السلام فرما رہے ہیں کہ تم نے بھی وہی کچھ کیا جو تمھارے باپ دادا نے کیا تھا۔

مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ : ''اللہ نے ان کے بارے میں کوئی دلیل نازل نہیں کی۔'' اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ بھی اللہ کو مانتے تھے۔ شرک ہمیشہ چلتا ہی اس طرح ہے کہ اللہ کو بھی مانا جاتا ہے اور ساتھ دوسروں کی بھی پرستش کی جاتی ہے۔ یہ تو دہریت اور سیکولرازم ہے جس میں اللہ کا تصور نہیں ہے۔ اس کے ماننے والے کہتے ہیں کہ یہ تو انسان کے اندر ایک فطری داعیہ ہے جبکہ حقیقت میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے خدا کہا جا سکے۔ ان کا نظریہ ہے کہ کائنات ایک حادثے کی پیداوار ہے اور خود بخود چل رہی ہے۔ اس میں ساری تبدیلیاں ایک آٹومیٹک سسٹم کے تحت ہو رہی ہیں۔ آج کے جتنے سائنسی علوم ہیں بالعموم ان کی بنیاد یہی ارتقاء کا نظریہ ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ آسمانوں و زمین کا مالک اللہ ہے اور وہی اس کا نظام چلا رہا ہے۔ ہر چیز پر اسی کا کنٹرول ہے اور وہی ساری تبدیلیاں کرتا ہے لیکن آج کی سائنس اور جدید علوم یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ مشرکین کا انداز اس سے تھوڑا الگ تھا۔ وہ کہتے تھے کہ اللہ بڑا ہے لیکن اس نے آگے اپنے اختیارات تقسیم کر رکھے ہیں۔ ہندوؤں نے بھی اسی قسم کا تصور پیش کیا کہ رام دنیا بنانے کے بعد آرام کر رہا ہے اور اس کے بعد دوسرے دیوتا باقی سارے کام کر رہے ہیں۔ ہندوؤں کے ہاں تو تین کروڑ خداؤں کا تصور ہے، دنیا میں جتنا شرک پھیلا ہے اس میں ہندوازم کا بہت بڑا حصہ ہے۔

مشرکین کی بات ہو رہی تھی تو وہ اللہ کے علاوہ اور بہت سارے خداؤں کو مانتے تھے جبکہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد رب تعالیٰ کی توحید کی دعوت ہے کہ سارے کام اللہ اکیلا کرتا ہے۔ اس کی ذات اور صفات میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ یہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت ہے، امتِ مسلمہ کو یہی دعوت دنیا کے سامنے پیش کرنی چاہیے۔ سچی بات ہے کہ اللہ رب العزت اگر مسلمانوں کو حکومت دے تو مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے اس مشن کو پوری دنیا میں پھیلایا جائے۔ سائنس انسان کی ضرورت ہے، اس سے انکار نہیں ہے۔ سائنسی علوم کا سیکھنا بہت ضروری ہے لیکن اس کے پیچھے دہریت کا تصور اور ارتقاء جیسی تھیوریاں درست نہیں ہیں، انھیں ختم کر کے ہر چیز کی بنیاد اللہ کی توحید پر رکھی جائے تو اس سے پھر دعوت پھیلے گی۔ دینِ اسلام کی دعوت کو صرف مسجد تک محدود نہیں رکھنا بلکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید

الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾

یہی دینِ برحق ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ﴿40﴾

کی صورت میں جو مکمل کتاب دی ہے، اس کی عملی شکل کو ہمیں دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔ ہماری سیاست، معیشت و معاشرت سمیت سب علوم کی بنیاد توحید پر ہونی چاہیے۔ اسی سے پھر اللہ کے فضل و کرم سے ہم دنیا کے سامنے صحیح معنوں میں یہ آفاقی دعوت پیش کر سکتے ہیں۔

ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کریں تو ان کی لکھی گئی سب کتابوں کی بنیاد توحید ہے۔ وہ سیاست و معیشت میں بھی توحید سکھاتے ہیں اور جدید فلسفوں اور صلیبی تصورات کا ردّ کرتے ہوئے بھی، الغرض وہ ہر چیز کو اللہ کی توحید سے وابستہ کرتے ہیں۔ اس دور میں صلیبیوں نے شام اور دوسرے بہت سارے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ مشرقِ وسطیٰ بھی صلیبیوں کے ہاتھوں میں جا چکا تھا اور انھوں نے ان ملکوں و معاشروں میں صلیبی دین کو اس طریقے سے پھیلایا تھا کہ سب علوم و فنون اس سے بری طرح متاثر ہوئے تھے۔ ان حالات میں پھر ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے زبردست کردار ادا کیا اور علمی انداز میں کفار کے بنیادی فلسفوں کا ردّ کر کے یہ بات سمجھائی کہ اصل چیز اللہ کی توحید ہے۔ انھوں نے اپنی کتب میں باطل نظریات کا جس طرح ردّ کیا آج وہ ساری باتیں دنیا کو سمجھانے اور ان کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت ہے۔ جدید سائنس کی بنیاد اگر الحاد پر رکھی گئی ہے تو اس کے مقابلے میں مسلمانوں کو صحیح سائنس پیش کرنی چاہیے۔

مسلمانوں میں موجود وہ سائنسدان جو سائنسی علوم و فنون کے ساتھ ساتھ دینِ اسلام کا بھی علم رکھتے ہیں، انھیں چاہیے کہ وہ آگے بڑھیں اور اس میدان میں بھرپور محنت کریں۔ مسلم حکومتوں کو بھی چاہیے کہ وہ ایسے لوگوں کی حوصلہ افزائی کریں اور انھیں کام کرنے کے مواقع عطا کریں۔ افسوس کی بات ہے کہ آج اگر کوئی اس جانب قدم بڑھانے کی کوشش کرتا ہے تو ساری دنیا اس کے پیچھے پڑ جاتی ہے اور حکومتوں پر دباؤ بڑھائے جاتے ہیں کہ ایسے لوگوں کو کام کرنے سے روکا جائے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ آپ صرف اتنا کہہ دیں کہ پاکستان مسلمانوں کا ملک ہے، ہم یہاں سے سود ختم کریں گے، کیوں کہ یہ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ ہے اور یہ کہ ہم یہاں اسلامی نظام قائم کرنا چاہتے ہیں تو بین الاقوامی قوتیں اور ادارے فوراً کہنا شروع کر دیں گے کہ آپ یہ کام کیوں کر رہے ہیں۔ جس طرح ریاست کے اندر ریاست نہیں بن سکتی، ایسے ہی عالمی طاقتوں نے گلوبل ویلج کا تصور پیش کر کے یہ بات باور کروانے کی کوشش کی ہے کہ ساری دنیا ہماری ہے اور ہماری مرضی کے برعکس اگر کوئی نظام چلانے کی کوشش کی جائے گی تو ہم اسے برداشت نہیں کریں گے۔

دنیا میں اس وقت مسلمان مختلف خطوں و علاقوں میں قربانیاں پیش کر رہے ہیں تو اس کے نتائج بھی اللہ تعالیٰ ضرور

عطا فرمائے گا۔ انھی قربانیوں کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو پھر سے وہ قوتیں عطا فرمائے گا کہ وہ سائنسی علوم و فنون کی بھی اصلاح کریں گے اور ہر چیز کو دین کی بنیاد پر قائم کیا جائے گا۔موجودہ دور میں اس چیز کی بہت ضرورت ہے اور اس کے بغیر آپ کی دعوت محدود ہے۔مسلمانوں کو تو پوری دنیا میں اسلام کی دعوت پیش کرنی ہے۔ مسلمان حکمرانوں کو ان علوم کی اصلاح و ترقی کے لیے بھرپور اور مؤثر کردار ادا کرنا چاہیے۔ بیت المقدس پر یہودیوں کا قبضہ ہے، صرف ایک اس مسئلے پر ہی مسلمان باہم متحد ہو جائیں تو یہ ایسا بنیادی مسئلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بہت جلد انھیں اچھے نتیجے دے گا، بہرحال یہ اللہ کی حکمتیں ہیں کہ وہ کس طرح نظام چلاتا ہے اور دنیا کے نظام کو کیسے تبدیل کرتا ہے۔ یہ سارا کچھ اسی کے ہاتھ میں ہے لیکن اس کے لیے راستہ یہی ہے جسے مسلمانوں کو اختیار کرنا ہے۔

آپ دیکھیں کہ مسلمانوں نے عباسی دور میں اگرچہ بہت بڑی بڑی لیبارٹریاں اور لائبریریاں بنائیں لیکن ابن سینا، ابن رشد اور ابن طفیل جیسے بڑے بڑے ماہر فلسفیوں نے بھی وہ کام نہیں کیا جو کیا جانا چاہیے تھا۔ یہ کام بنوامیہ کے دور میں ہوتا تو عباسی دور سے کہیں زیادہ مضبوط ہوتا، کیوں کہ اس دور میں جہاد کے جتنے شان دار اثرات تھے وہ بنوعباس کے دور میں نہیں تھے۔مسلمانوں کا اجتماعی نظاموں کے حوالے سے کام بنوامیہ کے دور تک اسلام کے بہت قریب رہا ہے۔اس کے بعد جہاد ترک ہوگیا۔ خاص طور پر عباسی دور میں اقدامی جہاد بالکل ختم ہو کر رہ گیا۔ اس دور میں پھر علوم وفنون کا بہت شور ہوا، بغداد میں علمی اعتبار سے جتنا کام ہوا اسے بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب دشمنوں کو موقع مل گیا کہ وہ مسلمانوں کے اندر گھس آئے اور انھوں نے بڑے بڑے مسلم حکمرانوں کا قرب حاصل کرلیا۔ اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کے فلسفیوں نے یونانی فلسفہ کو اسلام میں شامل کر دیا اور علوم و فنون کے نام پر مسلمانوں میں گمراہیاں پھیلائی گئیں۔

آپ ذرا وہ وقت یاد کریں جب خلفائے راشدین کے ادوار میں جہاد جاری تھا، اس کے بعد پھر بنوامیہ کے دور میں جہاد میں وسعت آئی تو اس وقت کیفیت کیا تھی؟ مسلمانوں نے اس دور میں جتنے کام کیے وہ بہت شان دار ہیں۔ آج کافر قوتیں مسلمان ملکوں کو خالص اسلام کی بنیاد پر کام کرنے کا موقع دینے کے لیے تیار نہیں ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے وعدوں کے مطابق ہر صورت میں اپنا دین غالب کرے گا، جیسا کہ فرمایا: ﴿ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَ دِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ؕ وَ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴾ [الفتح : ۲۸] ”وہی ہے جس نے ہدایت اور دینِ حق دے کر اپنے رسول کو بھیجا، تاکہ اسے تمام ادیان پر غالب کر دے اور اللہ کافی ہے گواہی دینے والا۔“ ایسے ہی اللہ کے رسول ﷺ کا بھی فرمان ہے :((إِنَّ اللّٰهَ زَوٰى لِي الْأَرْضَ، فَرَأَيْتُ مَشَارِقَهَا وَمَغَارِبَهَا، وَإِنَّ أُمَّتِيْ سَيَبْلُغُ مُلْكُهَا مَا زُوِيَ لِيْ مِنْهَا)) [صحيح مسلم، كتاب الفتن، باب هلاك هذه الأمة...: ۲۸۸۹] ”بے شک اللہ تعالیٰ نے میرے لیے

زمین کو لپیٹ دیا اور میں نے اس کے مشرقوں اور مغربوں کو دیکھ لیا اور جہاں تک یہ زمین میرے لیے لپیٹی گئی عنقریب میری امت کی حکومت وہاں تک پہنچے گی۔'' اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب کرنا ہے لیکن ہمیں اس بات کی فکر کرنے کی ضرورت ہے کہ کیا دینِ اسلام میرے اور میرے خاندان میں غالب اور نافذ ہے اور دین کے غلبے میں میرا حصہ کتنا ہے۔ غلبۂ اسلام کی تحریک میں اگر ہم اپنی محنت پر مطمئن نہیں ہیں تو اس آیت کو ہمیشہ ذہن میں رکھنا چاہیے: ﴿وَ اِنْ تَتَوَلَّوْا یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَكُمْ ۙ ثُمَّ لَا یَكُوْنُوْۤا اَمْثَالَكُمْ﴾ [محمد: ۳۸] ''اور اگر تم پھر جاؤ گے تو اللہ تمھاری بجائے دوسروں کو لے آئے گا، پھر وہ تمھاری طرح نہیں ہوں گے۔''

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ: ''فرماں روائی صرف اللہ کی ہے۔'' اوامر ونواہی کے حوالے سے حکم دینے کا سارا اختیار اللہ رب العالمین کے پاس ہے۔ وہ جسے چاہے حلال کہے اور جسے چاہے حرام کہہ دے، کوئی اس سے پوچھنے والا نہیں ہے۔ کائنات میں جس طرح رب تعالیٰ کا حکمِ تکوینی قائم ہے۔ سورج، چاند اور ستارے اللہ کے حکم سے کام کر رہے ہیں، ایسے ہی عبادت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ حکم دو قسم کے ہیں: ایک حکمِ تکوینی ہے اور دوسرا حکمِ تشریعی۔ یہاں حکمِ تشریعی کا ذکر ہو رہا ہے، البتہ آگے اسی سورت میں حکمِ تکوینی پر بھی بات ہو گی۔ حکم تشریعی وہ امور ہیں جن کا تعلق شریعت سے ہے۔ یہ حق صرف اللہ کا ہے کہ وہ شریعت کے احکام نازل کرے اور حلال وحرام کے ضابطے مقرر کرے۔ اس کے سوا کسی اور کے پاس سرے سے کوئی اختیار نہیں ہے۔ یہاں ایک بات سمجھ لیں کہ مسلمانوں میں مشاورت سے اجتماعی امور طے کرنا بالکل درست ہے۔ اللہ رب العالمین نے اپنے مومن بندوں کی یہی خاصیت بیان کی ہے، فرمایا: ﴿وَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَیْنَهُمْ﴾ [الشوریٰ: ۳۸] ''اور ان کے کام باہمی مشورے سے طے ہوتے ہیں۔'' یہ حکمت کے ساتھ باقی قانون بنا سکتے ہیں لیکن غیر اسلامی قوانین اور ضابطے بنا کر مسلمانوں کو ان کا پابند کر دینا درست نہیں ہے۔

اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّاۤ اِیَّاهُ: ''اسی نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔'' یعنی عبادت صرف ایک اللہ کی ہے غیر اللہ کی نہیں ہے۔ عبادت صرف نماز، روزے اور دیگر چند نیک اعمال کا نام نہیں ہے بلکہ ہر وہ کام جس کے کرنے یا جس سے رک جانے کا حکم دیا گیا ہے وہ عبادت ہے۔ عبادت کا دائرہ انسان کی پوری زندگی پر محیط ہے۔ جس طرح نماز، روزہ اور دوسری عبادات میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے، ایسے ہی مسلمانوں کے سیاسی ومعاشی امور اور تہذیب وثقافت بھی اللہ ہی کے لیے خالص ہونی چاہیے۔

ذٰلِكَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ: ''یہی دینِ برحق ہے اور لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔'' جو دین توحید پر مبنی نہیں ہے وہ سیدھا نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ ہمیشہ غلط ہی نکلے گا، اس سے اختلافات پیدا ہوں گے اور

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ
فَتَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ؕ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ؕ﴿۴۱﴾

اے میرے زندان کے ساتھیو! تم میں سے ایک تو اپنے مالک کو شراب پلائے گا اور رہا دوسرا تو اسے سولی دی جائے گی، پس پرندے اس کے سر کو نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ جن باتوں کی حقیقت تم پوچھ رہے تھے ان کا فیصلہ کیا جا چکا ہے ﴿41﴾

وہ بندوں کو غلط سمت میں ہی چلائے گا۔ دین قیم توحید کا دین ہے اور یہ صرف اس بات پر مبنی ہے کہ اللہ وحدہ لاشریک ہی کی عبادت کی جائے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ اکثر لوگ اس حقیقت سے واقف نہیں ہیں۔ بہت سارے لوگوں نے شرک کا نام توحید رکھا ہوا ہے اور عجیب وغریب فلسفے بنائے گئے ہیں۔ اس مسئلہ کو سب سے زیادہ انبیاء علیہم السلام نے سمجھایا ہے اور انبیاء علیہم السلام کے بعد ان کے وارث علمائے کرام کی ذمہ داری ہے کہ وہ سب سے زیادہ توجہ توحید کی جانب دیں اور سب لوگوں کو ایک اللہ کی عبادت پر جمع کریں۔

آیت 41 **يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا . . . .:** توحید کی دعوت کے بعد اب یوسف علیہ السلام ان کے خوابوں کی تعبیر بیان کر رہے ہیں، چنانچہ فرمایا کہ تم دونوں میں سے ایک اپنے بادشاہ کو شراب پلائے گا۔ اس کا مطلب ہے کہ اس کی رہائی ہو جائے گی اور اسے اس کی ڈیوٹی پر بحال کر دیا جائے گا جبکہ دوسرے کی رہائی نہیں ہو گی اور اسے سولی پر لٹکا دیا جائے گا۔ ابن کثیر رحمہ اللہ نے یہاں بہت اچھا نکتہ بیان کیا ہے، جس سے دعوت کا صحیح اسلوب سمجھ آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یوسف علیہ السلام نے یہ نہیں کہا کہ تیری رہائی ہو جائے گی اور تو بادشاہ کو جا کر شراب پلائے گا اور دوسرے سے کہا ہو کہ تجھے پھانسی ہو جائے گی بلکہ فرمایا: ﴿ اَمَّآ اَحَدُكُمَا ﴾ ایک کے لیے تعبیر یہ ہو گی اور " اَمَّا الْاٰخَرُ " دوسرے کے لیے یہ ہو گی۔ اس کا مطلب ہے کہ داعی کا اندازِ گفتگو بہت شان دار ہونا چاہیے۔ انبیاء علیہم السلام کی دعوت میں یہ بہت بنیادی چیز ہے جسے سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ: "جن باتوں کی حقیقت تم پوچھ رہے تھے ان کا فیصلہ کیا جا چکا ہے۔" مفسرین بیان کرتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی بیان کردہ تعبیر کسی ذاتی گمان پر نہیں بلکہ وحی کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ یوسف علیہ السلام بھی یہی بات کہہ رہے ہیں کہ میری بیان کی گئی تعبیر فیصلہ شدہ ہے۔ اللہ رب العالمین کی طرف سے یہ بات طے ہو چکی ہے۔ ایک نبی ہی کسی بات سے متعلق اتنے یقین سے کہہ سکتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نبی پر وحی نازل ہوتی ہے۔ نبی کے علاوہ جو کوئی بھی تعبیر کرے گا اس کی تعبیر ظنی قسم کی ہو گی۔ کبھی اس کی تعبیر صحیح اور کبھی غلط بھی ہو سکتی ہے لیکن نبی کا معاملہ ایسا نہیں ہوتا۔ یاد رہے تعبیر کے حوالے سے بہت احتیاط کی ضرورت ہے، جیسا کہ نبی ﷺ فرماتے ہیں: ((اَلرُّؤْيَا

وَ قَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ ۫ فَاَنْسٰىهُ الشَّیْطٰنُ
ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِی السِّجْنِ بِضْعَ سِنِیْنَ ﴿۴۲﴾ ع ۵ ۱۵

اور ان دونوں میں سے جس کے بارے میں اس (یوسف) کو یقین تھا کہ وہ رہائی پا جائے گا، اس سے کہا کہ اپنے مالک کے پاس میرا ذکر کرنا، تو شیطان نے اسے اس کے مالک سے ذکر کرنا بھلا دیا، چنانچہ وہ کئی سال قید میں رہے ﴿42﴾

عَلٰی رِجْلِ طَائِرٍ مَا لَمْ تُعَبَّرْ عَلَيْهِ، فَإِذَا عُبِّرَتْ وَقَعَتْ)) [صحیح ابن حبان: ۵/ ۳۵۱، ح: ٤٥٢٧] ''خواب گویا پرندے کے پاؤں پر ہے جب تک اس کی تعبیر نہ ہو جائے اور جب تعبیر ہو جائے پھر واقع ہو جاتا ہے۔''

آیت 42 ﴿ وَ قَالَ لِلَّذِیْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا . . . : یوسف علیہ السلام کو جس کے بارے میں یقین تھا کہ وہ رہا ہو جائے گا اس سے کہا کہ جب تو اپنے مالک کے پاس جائے گا تو اسے میرے بارے میں بتانا کہ میں ایک ناکردہ گناہ کے نتیجے میں جیل میں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کر رہا ہوں۔ پچھلی آیت میں کہا ہے: ﴿ قُضِیَ الْاَمْرُ ﴾ یہ فیصلہ شدہ بات ہے کہ ایک نے رہا ہونا ہے اور دوسرے کو پھانسی ہو گی جبکہ یہاں لفظ '' ظَنَّ '' آیا ہے، یعنی یہاں گمان کی بات ہے اور پیچھے یقین کی بات کی گئی ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات ظن یقین کے معنی میں بھی ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ رب العزت فرماتے ہیں: ﴿ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ﴾ [البقرۃ: ٤٦] ''جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ وہ اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور بے شک وہ اس کی طرف لوٹ جانے والے ہیں۔'' گویا ظن ہمیشہ ایک ہی معنی میں نہیں ہوتا۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ اس میں شک کا شائبہ ہوتا ہے۔ اگر کسی کام کے ہونے کا امکان زیادہ اور نہ ہونے کا کم ہو تو اسے بھی ظن کہتے ہیں۔

یوسف علیہ السلام کی قیدی سے ہونے والی گفتگو کی بات ہو رہی تھی تو وہ کہتے ہیں: ﴿ اذْكُرْنِیْ عِنْدَ رَبِّكَ ﴾ اپنے مالک کو میرے بارے میں ضرور بتانا تاکہ اسے یاد آ جائے۔ ہو سکتا ہے وہ مجھے قید کر کے بھول گیا ہو، لیکن اللہ رب العزت فرماتے ہیں: ﴿ فَاَنْسٰىهُ الشَّیْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ ﴾ شیطان نے اسے بھلا دیا۔ اسے بادشاہ کے سامنے اس بات کا ذکر کرنا یاد ہی نہیں رہا، حالاں کہ کھانا کھلانے والے یا شراب پلانے والے بڑے مقرب قسم کے لوگ ہوتے ہیں، انھیں بات کرنے کا زیادہ موقع ملتا ہے اور وہ مجلس کے علاوہ تنہائی میں بھی جا کر یوں بات کر لیتے ہیں کہ شاید دوسرے قریبی لوگوں کو بھی اس طرح کے مواقع نہیں ملتے۔ ابن کثیر رحمہ اللہ اور دیگر مفسرین نے لکھا ہے کہ یوسف علیہ السلام چاہتے تھے کہ میرا ذکر بادشاہ کے پاس ہو، تاکہ اسے یاد آ جائے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی رہائی کے لیے اس سے بہتر انتظام کر دیا۔ اس کا مطلب ہے کہ بندہ اپنے رب سے دعا کرے تو پھر اس بات سے پریشان نہ ہو کہ میری دعا قبول نہیں ہو رہی۔ اللہ رب العزت

وَ قَالَ الۡمَلِكُ اِنِّیۡۤ اَرٰی سَبۡعَ بَقَرٰتٍ سِمَانٍ یَّاۡكُلُهُنَّ سَبۡعٌ عِجَافٌ وَّ سَبۡعَ

اور بادشاہ نے کہا بے شک میں (خواب میں) دیکھتا ہوں کہ سات موٹی گائیاں ہیں، جن کو سات دبلی گائیاں کھا رہی ہیں

نے دعا جلد قبول کرنی ہے یا دیر سے، اس کی حکمت اور مصلحت وہی بہتر جانتا ہے۔ بندے کو اپنے رب پر پختہ یقین رکھنا چاہیے اور اس کی حکمتوں پر بہت مضبوط ایمان ہونا چاہیے۔

بعض مفسرین نے ایک روایت نقل کی ہے کہ اگر یوسف علیہ السلام یہ کلمہ نہ کہتے تو جیل خانے میں اتنی لمبی مدت نہ گزارتے کیونکہ انھوں نے اللہ کے سوا کسی اور سے مدد مانگی لیکن امام ابن کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ یہ حدیث سخت ضعیف ہے۔ یعنی ثابت نہیں ہے بلکہ ایک صحیح حدیث میں خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوسف علیہ السلام کے صبر کی تعریف کی ہے۔

[دیکھیے صحیح البخاري ، کتاب أحادیث الأنبیاء، باب قوله عزوجل : ﴿ ونبئهم عن ضیف إبراهیم ... ﴾ : ۳۳۷۲] نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ((عَجِبْتُ لِصَبْرِ أَخِي يُوْسُفَ وَكَرْمِهِ)) [سلسلة الأحاديث الصحيحة : ٤/ ٥٨٩، ح: ١٩٤٥] ''میں اپنے بھائی یوسف علیہ السلام کے صبر اور ان کی ہمت پر بڑا حیران ہوں۔'' سورۂ یوسف میں ان کے صبر کا ہی تو تذکرہ ہے اور اسی کے نتائج بیان کیے گئے ہیں، جیسا کہ سورت کے آخر میں اللہ رب العزت نے فرمایا: ﴿ اِنَّهٗ مَنۡ یَّتَّقِ وَ یَصۡبِرۡ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُضِیۡعُ اَجۡرَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴾ [یوسف : ۹۰] ''بے شک حقیقت یہ ہے کہ جو ڈرے اور صبر کرے تو بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔'' مفسرین نے یہاں یہ بات بھی لکھی ہے کہ اگر یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے سامنے اپنا ذکر کرنے کی بات کی تو اس کا مطلب ہے کہ اپنے معاملات اور امور میں دنیاوی وسائل کو استعمال کیا جا سکتا ہے، یہ کوئی غلط چیز نہیں ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے بھی اپنی قوم سے یہی فرمایا تھا: ﴿ مَنۡ اَنۡصَارِیۡۤ اِلَی اللّٰهِ ﴾ [الصف : ١٤] ''اللہ کی طرف (دعوت دینے میں) میرا مددگار کون ہوگا؟''

فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ سِنِيْنَ : ''چنانچہ وہ کئی سال قید میں رہے۔'' ''بِضْعَ'' تین سے لے کر نو تک کے عدد پر بولا جاتا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے: ((اَلْبِضْعُ مَا بَيْنَ الثَّلَاثِ إِلَى التِّسْعِ)) [مسند البزار : ٣١٦۔ صححه الألباني في صحيح الجامع الصغير : ٢٨٨٧] ''بِضْعٌ'' تین سے لے کر نو تک کے عدد پر بولا جاتا ہے۔'' اس کا مطلب ہے کہ یوسف علیہ السلام دس سال سے کم ہی جیل میں ٹھہرے تھے۔ بعض نے سات سال کا عرصہ قرار دیا ہے، لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس حوالے سے کوئی عدد بیان نہیں کیا اس لیے ہمیں بھی ان چیزوں میں نہیں الجھنا چاہیے۔ رب تعالیٰ نے جو فرما دیا اور جتنا فرما دیا اسی پر ہمیں یقین رکھنا ہے۔